Regd. No. A. 401
Telephone No. 28
Telegram "ANJUMAN"

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد

جلد ۱۶ | علی گڈھ - ۸ نومبر ۱۹۵۷ ع | شمارہ ۴۲

مرزا تفتہ

از :- سید خضر برنی

منشی ہرگوپال تفتہ غالب کے حلقہ میں ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے نام غالب کے خطوط ہی تفتہ کی بقائے دوام کے ضامن ہیں لیکن تفتہ صرف پرتو مہر سے ہی تفتہ و ضیا ریز نہیں۔ ان کا سرمایۂ کمال نو ہزار اشعار کا فارسی دیوان ہے جو دوبارہ ایام غدر میں طبع کرو کر لاہور سے طبع ہوا۔

سن طبع دوم آمد بس چہ خالی نسخۂ باطبع شد واہ
۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۹ء

سکندرآباد جو مرزا تفتہ کا وطن ہے بلند شہر میں کشتوں کی راجدھانی ہے، اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ، اس شہر میں اب تک یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے کہ غالب مرحوم دلی سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں جہانگیرآباد گئے تھے تو راہ میں تفتہ کے یہاں قیام کیا تھا اس زمانے میں دو گھوڑوں والی بند گاڑیوں کی ڈاک چلا کرتی تھی اور راہ میں کئی جگہ گھوڑے بدلے جاتے تھے۔

مرزا ہرگوپال کے وجود کی برکت ہے کہ سکندرآباد میں اب تک شعر و شاعری کے قدرداں و معرکہ آرا موجود ہیں۔

تفتہ کا دیوان ۱۰۰۰ صفحات اور ۹۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ چھ حصوں میں سے پانچ غزلیات کے [illegible] وقف ہیں چھٹے میں دو نوحے ہیں، ایک اپنے دوازدہ سالہ لڑکے جیجر سنگھ اور دوسرا (غالباً) اپنے شاگرد بانکے لال رند کے انتقال پر، پہلے نوحے میں ساڑھے تین سو شعر ہیں، جو تقریباً اکیس فقرے کے بند میں منقسم ہیں۔ دوسرے نوحے میں ڈھائی سو شعر ہیں جو تشکیل دیا ہے۔ اٹھتیرا (؟) شعر کا ایک قطعہ ایک صاحب سوم پر رضی الدین خاں کی مدح میں ہے آخری ۴۴ صفحات میں رباعیات ہیں اور قطعات۔

غزلیات میں تفتہ کا مسلک یہ ہے کہ اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، مثلاً حزیں کی ایک غزل کا مطلع سامنے رکھا اور اس پر اسی زمین میں بالعموم دو یا تین اور کبھی کبھی چار غزلیں لکھ ڈالیں۔ غزلوں کا تناسب اس طرح ہے۔ سو غزلوں میں اسیر کی غزلوں پر ۵ غزلیں ہوں گی۔ عرفی کی غزلوں پر دس، ظہوری کی غزلوں پر تیس۔ باقی سات غزلوں میں چار غزلیں ایسی ہوں گی جن میں تتبع ظاہر نہیں ہے اور ایک ایک اگلی حزیں، فیضی اور قاآنی کی غزلوں پر ہوگی۔ یہ روش ہمیں شیفتہ کے یہاں بھی ملتی ہے۔ تفتہ کے یہاں سانچے اور تنگ ہو گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے یہاں باوجود تخلص کی تابش کے وہ گرمی اور حرارت بھی نہیں جو شیفتہ کے یہاں سانچے کو تھوڑی دیر کے لئے پگھلا دیتی ہے۔ شیفتہ کے اشعار شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ بہت ہموار ہیں اور بندش اور عروض کے اعتبار سے عموماً بے عیب، وہ اس قدر ہموار ہیں کہ چبھتے کہیں نہیں اور یہی ان کی کمزوری ہے۔ تفتہ کے کوچے میں پہنچ کر غزل کی تنگنائے اور تنگ ہو جاتی ہے ایک محتاط راہرو اور ایک سعادت مند پیرو کی طرح وہ ایک قدم بھی اس گلی سے ہٹ کر نہیں رکھتے لیکن اس سے یہ استنباط کرنا غلط ہوگا کہ تفتہ کی تمام غزلیں سپاٹ ہیں۔ وہ اپنا مخصوص فنی خط رکھتی ہیں علاوہ بریں ہر صفحے میں ایک آدھ شعر ایسا ضرور مل جاتا ہے جو توجہ جذب کر لیتا ہے۔ مضامین میں موشگافیاں اور نکتہ سنجیاں کی ہیں جن میں رعایت لفظی اور رعایت خیالی کا حصہ وافر رہتا ہے۔

بامدوستے کہ از گریباں دود
دامن انفعال فرا گیرد
کفر ہ گذاریم ہاتا زندہ ایم
گر رگ جاں است زنار کے

تخیل کا حسن دیکھئے۔

نگہ از پشت پا در حشر ہرگز بر نمی خیزد
زبار معصیت ہا بسکہ پشت من خمید ابجا

تقابل کا اکثر التزام ہے۔

در عہد خواب می کنم من پیر	برلب افسانہ سودائی ما
از تقاضائے نگاہ او پیداست	دیدہ آں دیدن تنہائی ما
از ازل در تو تا ابد با من	مشت عہدی و تخت جائی ما

مضمون آفرینی کی چند مثالیں یہ ہیں۔

جگر کہ منصب بچہ عہد زور داشتہ است

یعنی ملامت ہمہ عالم کشیدہ ایم
آہنگ نار کرد دل و گفت دیدہ ام
باید بہ حال و حشت عشق گریستن
من گمرد کفر گردم و ایشاں جگر و من
دانند اہل دیں بہ من آیا چہ احتیاج

اور نشتر بھی ہیں۔

روز عیدم چہ داد پیر مغاں	کہ صواب سہ صیام گرفت
نویدی ای نسیم از فصل گل دہ	نوید جیب و داماں تازہ گرداں
تنگ اندر بیت بسیار بود است	عیار سینہ ریشاں تازہ گرداں

فارسی پر تفتہ کی قدرت حیرت انگیز ہے۔ یہ کم و بیش اہل زبان کی فارسی ہے۔ وہ فارسی نما ہندی نہیں جو منشیانِ ہند سے منسوب ہے۔

تفتہ کے دو نوحوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ در اصل یہ دونوں ان کے پورے دیوان پر بھاری ہیں لڑکے کے غم میں تفتہ حقی نکتہ سنجیاں بھول جاتے ہیں۔ دل پر چوٹ لگتی ہے تو درد بھری صدا نکلتی ہے۔ درد، تاثیر اور زور ان مرثیوں کی خصوصیات ہیں۔ خوف طوالت مانع ہے۔ ورنہ دونوں نوحے تمام و کمال نقل کر دیے جاتے۔ حافظ کے وہ اشعار بے ساختہ یاد آتے ہیں جو انھوں نے اپنے لخت جگر کی رحلت پر لکھے تھے۔

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند	چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں
بجائی لوح سیمیں درکنارش	فلک برسر نہادش لوح سنگیں

رباعیات اور قطعات معمولی ہیں۔

الغرض تفتہ کو فارسی پر بڑا عبور ہے۔ وہ بہت پرگو ہیں اور بالالتزام تیرہ کو جاہ کر کے کہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ رسمی اور سپاٹ اشعار کی کثرت ہے۔ تفتہ ان شعراء میں ہیں جن کے یہاں جزو کل سے بڑھ کر ہوتا ہے اگر تفتہ کے تو ہزار اشعار میں سے صرف پانچ سو شعر منتخب کر لئے جائیں تو وہ مجموعہ ان کے دیوان سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوگا۔

زر خالص کی قیمت جب ہی لگتی ہے جب اسے پگھلا کر الگ کر لیا جائے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تفتہ کا کوئی شعر اردو زبان میں دستیاب نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زبان میں انھوں نے کوئی شعر کہا ہی نہیں۔

پیمبر کے نوحہ کا ایک بند ہے جس کی ردیف ہے "گذاشتی" اور قوافی محرم، مرہم وغیرہ۔ اس کے دو اشعار پر ان سطور کا خاتمہ کرتے ہیں۔

وقتی کہ در فنا ے تو بنیاد فتنہ تاخت
ای آہوئی جہندہ چرا رم گذاشتی
گو روز جمعہ خانہ بسی ساختی بہ لہو
بنیاد عمر خویش نہ محکم گذاشتی

دوسرے شعر پر تین ✻ لگے ہوئے ہیں اور حاشیہ پر تفتہ کا پُر افتخار نوٹ ہے۔

ہٰذا صادر رنجہ، خامۂ مولانا غالب است

اس سے ایک طرف غالب کے معیار کی بلندی اور ان کے تنقیدی خلوص پر روشنی پڑتی ہے کہ سوا تین سو اشعار میں سے صرف ایک شعر کو لائق اعتنا سمجھا، دوسری طرف تفتہ کی عقیدت مندی ظاہر ہوتی ہے کہ اسی ایک شعر کو اپنے لئے سرمایۂ کمال و سرچشمۂ افتخار سمجھا۔ یہی ظرف تھا جو جستجوئے کمال میں خضر راہ کا کام دیتا ہے۔ فی زمانہ اس کا فقدان ہے جس کے باعث ہر نو مشق خود کو منتہی جانتا ہے۔ ہر قافیہ پیما خود کو اساتذہ میں شمار کرنے لگتا ہے۔ خام کاروں کی کثرت کا ظرف کی قلت سے براہ راست تعلق ہے۔

ہماری زبان

۸ نومبر ۵۷ء

اُردو ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد ہندستان میں اگرچہ اُردو زبان کے ساتھ ابھی انصاف نہیں ہوا، لیکن اردو ادب کی مقبولیت برابر بڑھ رہی ہے۔ اردو کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کے متعلق ہندی میں اچھی خاصی تعداد میں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ دوسری ہندستانی زبانیں بھی اس طرف متوجہ ہو رہی ہیں۔ ہندی کے اچھے رسالوں میں اُردو کے شاعروں کی نظمیں، غزلیں، افسانے ہندی رسم خط میں شائع ہوتے ہیں۔ ہندستانی ادب کی خصوصیات کا ذکر آتا ہے تو اُردو ادب سے بھی مثالیں دی جاتی ہیں۔ ساہتیہ اکاڈمی اور آل انڈیا ریڈیو جب ہندستانی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اُردو ادب کی بھی نمائندگی ہوتی ہے۔ مرہٹی، گجراتی، کنڑا میں اُردو کے شاعروں کا کلام ترجمہ ہو کر شائع ہوتا ہے۔ اُردو کے مشہور شاعروں کے نام ہندوستان میں بیشتر پڑھے لکھے جانتے ہیں۔ ابھی حال میں بمبئی کے ایک تاجر نے جو صرف ہندی اور انگریزی جانتے ہیں، دیوان غالب کے ایک خاص ایڈیشن کے لئے تیس ہزار روپیہ دیا ہے۔ یہ ایڈیشن اُردو اور ہندی دونوں رسم خط میں شائع ہوگا اور اس پر ایک مفصل مقدمہ اور ضروری حواشی ہوں گے۔ غالب کے بعد دوسرے شعرا کا انتخاب بھی کیا جائے گا۔ حکومت ہند اُردو کے کئی شاعروں اور ادیبوں کو وظیفے دیتی ہے۔ مرکز کی طرف سے ہر سال ایک انعام بہترین اُردو کتاب پر دیا جاتا ہے جو پانچ ہزار روپے کا ہے۔ یو۔پی کی حکومت ہندی کے علاوہ اُردو کی کتابوں پر بھی انعام دیتی ہے۔ مرکز نے علی گڑھ یونیورسٹی کو تقریباً سوا لاکھ روپیہ تاریخ ادب اُردو تیار کرنے کے لئے دیا ہے۔ سارے ملک میں مشاعرے ہوتے ہیں اور ان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ فلم کی وجہ سے اُردو کے کئی اچھے شاعر اور ادیب خوشحال کہے جا سکتے ہیں۔ اُردو کے رسالے اور کتابیں پہلے سے زیادہ تعداد میں چھپتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد کافی نہیں۔ اس میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔ مگر اضافے کا احساس بھی ضروری ہے۔ چونکہ خواندگی کے ساتھ ذوق کی تربیت نہیں ہوئی اس لئے سستا ادب بہت عام ہے مگر یہ پہلو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ لاکھوں آدمی اس کے ذریعہ سے اُردو پڑھتے ہیں۔ ادب کی مقبولیت زبان کے ساتھ بے انصافی کو ضرور کم کرے گی۔ جو لوگ بار بار اعلان کرتے ہیں کہ ہندستان میں اُردو فنا ہو گئی، انھیں اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔

بہار ریاستی اُردو کانفرنس

یہ کانفرنس ۲، ۳ نومبر کو پٹنے میں ہوئی۔ اس کا افتتاح بہار کے وزیر اعلیٰ سری کرشن سنہا کرنے والے تھے، مگر وہ کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکے۔ جناب شیو ناتھ پرشاد سپیکر ڈی۔ اے۔ وی کالج بنارس نے اس کا افتتاح کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند نے صدارت فرمائی۔ جنرل سکریٹری [illegible] نے اپنی رپورٹ میں شاخ کی چھ سال کی کارگزاری کی روداد پڑھ کر سنائی۔ انجمن کی یہ شاخ بہار میں اُردو کے حق کے لئے برابر جد و جہد کرتی رہی ہے۔ اس نے دس لاکھ دستخط فراہم کرکے صدر کے سامنے پیش کئے تاکہ اُردو کو بہار کی علاقائی زبان قرار دیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اُردو کی تعلیم چلن اور مقبولیت کے لئے برابر ساعی رہی ہے۔ صدر نے اپنے خطبے میں اُردو کی قومی حیثیت پر زور دیا۔ انھوں نے حکومت اور اکثریت کو توجہ دلائی کہ اُردو کے ساتھ انصاف سے ملک کی ترقی ہوگی۔ اُردو دوستوں سے انھوں نے ضبط و نظم اور عمل کا مطالبہ کیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر سید محمود اور شری پٹیل وزیر صحت ریاست بہار نے تقریریں کیں اور اُردو دوستوں کی پرجوش الفاظ میں ہمت افزائی کی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ جیسے جیسے ملک میں تعمیری جد و جہد بڑھتی جائے گی اُردو کے ساتھ اور بہتر سلوک ہوگا۔ ڈاکٹر محمود نے خاص طور پر اپیل کی کہ اُردو کو اور آسان بنایا جائے۔ کانفرنس میں چھ قرار دادیں منظور ہوئیں۔ سب سے اہم قرار داد میں علاقائی زبان کے مطالبے کو دہرایا گیا۔ ریاستی شاخ کے نئے انتخابات عمل میں آئے۔ اور شب میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ کانفرنس میں اُردو کی تحریک کے بنیادی مقاصد کو خوبی سے واضح کیا گیا اور بہار میں اُردو کی ترقی کے لئے مفید تدابیر پر غور ہوا۔

اردو کانفرنس احمدآباد

احمدآباد کی اردو کانفرنس ۲۰ نومبر کو پروفیسر احتشام حسین رضوی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں شہاب الدین دسنوی صاحب، کیفی اعظمی صاحب، بشیر الدین ذکی صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن خانوی صاحب نے تقریریں کیں۔ جلسہ میں بیس ہزار سے زیادہ افراد نے شرکت کی۔ ابتدا میں احسان جعفری صاحب نے کانفرنس کے نام پیغامات پڑھ کر سنائے اس کے بعد پروفیسر وارث حسین علوی نے ڈیلی گیٹ سیشن کی منظور کی ہوئی تجویزوں پر روشنی ڈالی صدر کانفرنس نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو کے لئے جب تک کوئی مخصوص علاقہ قرار نہیں دیا جاتا اس وقت تک ہمارے مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اگر شمالی ہندوستان میں اردو کو اس کا جائز مقام مل جاتا ہے تو پھر بقیہ ہندستان میں بھی اردو کے لئے حالات موافق ہو جائیں گے۔ کانفرنس میں حسب ذیل تجویزیں پاس ہوئیں۔

اردو کو ہندستان کے شمال جمہوریہ میں علاقائی زبان منوانے کے مطالبہ کی تائید کرتے ہوئے دسمبر میں منعقد ہونے والی آل انڈیا اردو کانفرنس دہلی کا خیر مقدم کیا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ اگر صدر جمہوریہ سے اردو وفد کی مجوزہ ملاقات کے بعد کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو تو ملک کی تمام جمہوری پارٹیوں اور تعلیمی اداروں کا ایک کنونشن بلایا جائے۔

اردو کو بلا دوسری قومی زبانوں سے زیادہ سے زیادہ قائم کیا جائے اور گجراتی زبان کے مشہور شاعروں کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرایا جائے۔

اردو کے سب سے پہلے شاعر شمس الدین ولی کے مزار واقع احمدآباد کو ایک قومی یادگار بنانے کی میونسپل کارپوریشن احمدآباد سے اپیل کی گئی اور اس کی انجام دہی کے لئے ایک کمیٹی تشکیل ہوئی۔

احمدآباد میں پریس کا کاروبار کرنے والوں سے اردو کا ٹائپ پریس قائم کرنے کی درخواست کی گئی اور اس سلسلے میں بھی ایک کمیٹی کا تقرر ہوا۔

طلبہ اور تمام محبان اردو سے اپیل کی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات میں شریک ہوں۔

انجمن ترقی اردو احمدآباد کی سرپرستی کی کوشش ہو اور ہماری زبان، علی گڑھ کے خریداروں کی تعداد بڑھانے کے اقدامات کئے جائیں۔

میونسپل کارپوریشن احمدآباد کے کتب خانوں میں اردو کتابوں کی فراہمی کے طریقے کو غیر تسلی بخش سمجھتے ہوئے ایک کمیٹی اس غرض سے متعین کی گئی کہ وہ کارپوریشن کی پرچیز کمیٹی سے مل کر کتابوں کی مناسب فراہمی کے سلسلے میں کارروائی کرے۔

احمدآباد یا گجرات کے کسی بڑے شہر میں ایک اردو ٹریننگ کالج قائم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ یہاں کے مدرسین کو باہر جانے کی دقت پیش نہ آئے۔

شہر میں ایک اردو ہائی اسکول کی ضرورت کی طرف تعلیمی اداروں کو توجہ دلائی گئی اور انجمن اسلام احمدآباد سے خاص طور پر اپیل کی گئی کہ وہ اپنے ماتحت اسکولوں میں کم از کم ایک سیکشن میں پانچویں سے گیارہویں جماعت تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے تاکہ ثانوی اسکولوں میں گجراتی ذریعہ تعلیم کی دقت اردو پڑھے ہوئے بچوں کو پیش نہ آئے۔

اردو امتحانات کے لئے ایسے ممتحن مقرر کئے جائیں جو اردو جاننے کے علاوہ اس کی باقاعدہ اسناد بھی رکھتے ہوں۔

اردو داں طلبہ کو ان کی خواہش پر اردو میں اعلیٰ تعلیم دلانے کا انتظام کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو احمدآباد اور دوسرے تعلیمی اداروں سے اپیل کی گئی۔

محکمہ رسل و رسائل سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے یہاں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کو جگہ دے۔

حکومت بمبئی سے پرزور اپیل کی گئی کہ اردو مدارس کے معائنہ کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جن کی زبان اردو ہو جیسا کہ گجرات کے بعض اضلاع مثلاً احمدآباد یا پنچ محل میں ہوا ہے۔

کانفرنس نے ایک تعزیتی قرارداد منظور کی جس میں سید عزیز حسن بقائی، آزاد سبحانی، آغا محمد طاہر، عابد مجیب، مولانا اطہر ہاپوڑی، اشک مرتسری، مجید لاہوری، آسی پھولپوری اور راز صدیقی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور پسماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر کی گئی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جدوجہد آزادی میں اردو زبان کی عظیم خدمات کو سراہتے ہوئے اس عرصہ میں شہید ہونے والے اردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی یادگار قائم کرنے کی حکومت سے درخواست کی گئی۔

مدھیہ پردیش اردو کنونشن

مدھیہ پردیش اردو کنونشن ۱۶ اور ۱۷ نومبر کو شائع شدہ پروگرام کے مطابق بھوپال میں منعقد ہو رہا ہے سب انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں۔

مُراسلات

ہماری زبان

پچھلے دنوں کسی اشاعت میں آپ کی تجویز نظر سے گزری کہ ادارہ پرچے کی ضخامت میں مزید اضافہ کرنے کی تجویز پر غور کر رہا ہے۔ میں اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ صفحوں کے اضافہ کے ساتھ اس میں چھپنے والے مواد کی طرف بھی خاص دھیان دینا ضروری ہے۔ میری ناقص رائے میں پرچے میں جو اضافہ ہو اسے ادبی چیزوں میں صرف کیا جانا چاہئے۔ خاص کر کہانی اور افسانوں کی کمی تو بڑی طرح محسوس ہوتی ہے اس سے ہماری زبان کی اشاعت میں خود بخود ترقی ہوگی اور پھر لازمی طور پر کمرشل اشتہارات بھی ملیں گے۔

دلیش چترکار

جلسہ اور مشاعرہ

عزیز رہانی صاحب عزیز اطلاع دیتے ہیں۔

جونپور میں ایک کل ہند مشاعرہ گوتمی میلن اور ادبی جلسہ ۱۰ر نومبر کو جناب شفیق جونپوری کے اعزاز میں ہو رہا ہے۔ ادبی اجتماع کی صدارت مولانا سعید احمد اکبرآبادی کریں گے۔ اور مشاعرہ کی صدارت حیات اللہ انصاری صاحب ایڈیٹر قومی آواز نے منظور کرلی ہے۔

اردو کلب کرنول

۱۳ر اکتوبر کو اُردو کلب کرنول میں ایک ادبی مباحثہ منعقد ہوا جس میں ممبروں اور اُردو دوست حضرات نے شرکت کی۔ جناب ناصر کرنولی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی یہ تجویز منظور ہوئی کہ فراق اور آثر دونوں اُردو دنیا کی قابلِ احترام ہستیاں ہیں۔ انھیں باہمی چشمکیں بند کر دینا چاہیے۔ تاکہ مکدر فضا جلد ختم ہو۔

اُردو انجمن مہارانی کالج میسور

مہارانی کالج میسور اُردو انجمن کا افتتاح ۱۵ر اکتوبر ۶۵ء کو ہوا۔ صدارت کے فرائض محترمہ رحمت النساء بیگم نے انجام دیئے۔ افتتاحی خطبہ محترمہ سیدہ خاتون بی۔ اے نے پڑھا جس میں اُردو غزل کی رمزیت اور اشاریت کو واضح کیا گیا تھا۔ انجمن کی صدر ڈاکٹر آمنہ خاتون مقرر کی گئیں۔ جلسہ کے اختتام پر معتمد انجمن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

رونق آرا بیگم

محترمہ سعیدہ نکہت کی خدمت میں

آپ کا مکتوب ۲۲ر اکتوبر کے "ہماری زبان" میں نظر سے گزرا۔ آپ نے میری تنقیدی تحریروں کو جن حوصلہ افزا الفاظ میں سراہا ہے۔ اُن کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ایک تبصرہ نگار کو کسی کتاب پر لکھتے وقت زیرِ نظر کتاب کو موضوعِ بحث بنانا چاہئے نہ کہ مصنف کے فن کو مجموعی طور پر۔ لیکن اگر آپ نے عدم کے کلام کے تمام مجموعوں کو سامنے رکھ کر غور کیا ہوتا تو یہ بات آسانی کے ساتھ معلوم ہوسکتی تھی کہ ان کے کلام کی یکسانیت فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کے سب مجموعوں میں ایک ہی انداز کی غزلیں ہوتی ہیں اور خیالات و کیفیات یا اظہار بیان کے اعتبار سے ہم کسی نئی منزل یا نئے موڑ سے دوچار نہیں ہوتے۔ یہ بات اُردو کے بعض اور ادیبوں کے یہاں بھی ملتی ہے جن کا میں یہاں نام لینا مناسب نہیں سمجھتا ورنہ "ہماری زبان" میں ایک لمبی بحث چھڑ جائے گی لیکن کنھیا لال کپور کا ایک فقرہ ضرور سنا دینا چاہتا ہوں جو انھوں نے موجودہ دور کے ایک افسانہ نگار کے بارے میں لکھا ہے کہ "ان کے سب افسانے آپس میں نہ صرف ایک دوسرے کے بھائی بلکہ جڑواں معلوم ہوتے ہیں"! اب ایسی صورت میں تبصرہ نگار ان کی نئی کتاب کے بارے میں نئی تنقید کہاں سے لائے۔ میرا اس سلسلے میں یہ اصول ہے کہ اس مصنف کے جن پہلوؤں پر اب تک عام لوگوں کی نظریں نہیں جاسکی ہیں اس کی طرف متوجہ کردوں۔ عدم اور خیام کی مماثلت کے سلسلے میں جو بات مجھے عرصہ سے کھٹک رہی تھی۔ اس کے اظہار کے لئے میں نے اس تبصرے میں ضروری سمجھا کیونکہ میں ان کے کلام کے تفصیلی مطالعہ اور تنقید و تبصرہ یا تجزیہ و تحلیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

خلیل الرحمن اعظمی

سعدی دکنی

از شیخ فرید برہان پوری

یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کے "ہماری زبان" کے شمارہ میں سعدی دکنی پر راقم کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے اس مضمون کی ترتیب کے وقت "گنج الیقین" ملفوظات حضرت شاہ بھکاری (متوفی ۹۰۰ھ) کا قلمی نسخہ زیرِ نظر

نہ تھا۔ لہٰذا اصل عبارت کے عبارت ترجمہ سے عبارت نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔

فارسی عبارت درج ذیل ہے۔

"در مقام اللہ نور جری یک اژدر و یک شیر کلاں ساکن بود چون آن مقام سلطان العارفین حضرت شاہ قدس سرہٗ مرحمت شد۔ حضرت شاہ آمدہ آن اژدر را گفت۔ اے اژدر! این مقام بنام فقیر شدہ است۔ تو رفتہ در بر ساکن باش۔ آن اژدر بحکم ایشان رفت۔

بعد ازاں شیر در زیر درخت انجن ساکن بود۔ حضرت شاہ آن را فرمود کہ اے شیر! حالا ازیں جا برو۔ جائے تو بر است و خدمت حضرت شیخ سعدی بکن۔ کہ این جا شہر آباد خواہد شد۔ شیر در ہمان وقت در بر رفت و بخدمت روضۂ متبرک حضرت شیخ سعدی می آمد" (ورق ۱۴ قلمی)

(مملوکہ جناب بشیر محمد خاں صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی لیگ)

اقتباس بالا کی یہ حکایت بالکل عجیب معلوم ہوتی ہے مگر اہل باطن کے یہاں یہ انوکھی بات نہیں۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ اہل ظاہر کو اسے تصوف کی خصوصی شان یا روح سمجھنا چاہئے۔

سعدی دکنی؟

از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

"ہماری زبان" کے شمارہ ۸ر ستمبر ۵۶ء میں میں نے اپنی ایک یادداشت پیش کی تھی۔ جس کے مطابق اردو تذکروں میں لکھی ہوئی معروف غزل سے سعدی غزل انگیختہ الخ۔ کسی سعدی کی نہیں بلکہ ملا شیری کی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ یادداشت بہت عرصہ ہوا میں نے انجمن ترقی اردو دہلی کے کتب خانہ کی ایک قدیم بیاض سے لکھی تھی اور اسے کہیں رکھ کر ایسا بھولا کہ بالکل ذہن سے نکل گئی تھی۔ اسی لئے اپنے مقالہ "داستان شاعری" میں اور اپنے خط مورخہ ۸ر مئی ۵۶ء بنام شیخ فرید صاحب برہانپوری میں اس یادداشت کے متعلق کوئی اطلاع نہ دے سکا۔

اب اس غزل کے متعلق یہ تنقیحیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ کیا یہ غزل کسی ہندی سعدی کی ہے؟
۲۔ کیا کوئی سعدی ہندوستان میں بھی گزرے ہیں؟
۳۔ اور کیا وہ سعدی شاعر بھی تھے؟

میری یادداشت مذکورہ بالا کے پیش نظر یہ غزل کسی سعدی کی نہیں بلکہ عہد اکبری کے ایک درباری فارسی کے شاعر ملا شیری کی ہے اور اگر یہ بات صحیح ہو تو تمام بحث یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو کے تذکرہ نویسوں نے اسے سعدی دکنی کی غزل بتایا ہے۔ اردو تذکرہ نویسی ہمیں ۱۱۶۵ھ سے پہلے نہیں ملتی اس لئے شروع گیارھویں صدی کی وہ بیاض جس میں سے میں نے اپنی یادداشت لکھی اولیت کا شرف رکھتی ہے۔

اب سعدی کی شخصیات کے بارے میں سن لیجئے۔ ہندوستان میں دو بزرگ سعدی نام کے گزرے ہیں۔ ایک کاکوری (یو۔ پی) کے کہے جاتے ہیں دوسرے برہانپور کے۔ (بحوالہ مضامین سعدی دکنی۔ ہماری زبان یکم اکتوبر ۵۶ء و سعدی رسالہ سب رس شمارہ ستمبر و اکتوبر ۵۶ء از شیخ فرید صاحب برہانپوری) حکیم شمس اللہ قادری صاحب نے سب سے پہلے اپنی کتاب تاریخ اردوئے قدیم (ص ۱۱۴) میں سعدی کو ملا نظام الدین اور عبد القادر بدایونی اور بختاور خاں کے حوالے سے بتایا کہ سعدی کاکوری کے تھے۔ لیکن یہ بتانا بھول گئے کہ عہد اکبری کے اول الذکر دو مصنفین نے سعدی کو بزمرۂ مشائخ شمار کیا ہے شاعروں کی صف میں نہیں۔ البتہ بختاور خاں متوفی ۱۲۰۴ء (صاحب مراۃ العالم) نے اتنا لکھا ہے کہ:-

"طبع موزوں داشتے و بہ زبان فارسی و ہندی شعرے نیکو گفتے"

مراۃ العالم مجھے یہاں دستیاب نہ ہو سکی۔ جس سے یہ اندازہ لگاتا کہ بختاور خاں نے کس سعدی کے متعلق یہ جملہ لکھا یا کس حوالے سے لکھا لیکن یہ طے ہے کہ بختاور خاں عہد عالمگیری کے مصنف تھے اس لئے زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری (ص ۱۸۸، ۱۸۹، اصح المطابع لکھنؤ مطبوعہ ۱۹۲۷ء) میں ان کا

(باقی ص ۹ پر)

فیض کی نظم "یاد" کے بارے میں

سلامت اللہ خاں شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی

فیض کی نظم "یاد" پر جو اعتراضات " ہماری زبان " (۸۔ اکتوبر) میں کئے گئے ہیں وہ بہت حد تک گمراہ کن ہیں۔ کسی شاعر کی زبان و بیان کی کوتاہی پر نکتہ چینی کرنا بذات خود کوئی غلط بات نہیں ہے لیکن اس قسم کے اعتراضات اکثر غلط جذبے کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ ان اعتراضات کا مقصد زبان و بیان کی صحت کو قائم رکھنا ہوتا ہے اور اس میں تمسخر نہ صرف بے محل ہے بلکہ اس سے نکتہ چیں کے خام تنقیدی شعور کا پتا چلتا ہے۔

فیض کی شاعری کی چند نمایاں خصوصیات فکر کی گہرائی تخیل کی لطافت، بیان کی خوش سلیقگی اور ٹھہراؤ اور ایک خاص قسم کی فکر انگیز اشاریت (SUGGESTIVENESS) ہیں۔ یہی خصوصیات ان کی شاعری کو ان کے ہم عصروں کی شاعری سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ تمام خوبیاں ان کی نظم "یاد" میں بھی ہیں جس کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ پوری نظم کی تشریح غیر ضروری ہے کیونکہ اس نظم میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ یا قاری پر اثر انداز نہ ہوسکے صرف چند ترکیبوں کی وضاحت کافی ہے۔

(۱) "آواز کے سائے" پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ سایہ صرف "کسی جسم کا ہوتا ہے" اگر یہ صحیح ہے تو "خواب و خیال" کی پرچھائیاں کیسے ہوسکتی ہیں؟ خواب و خیال کے بھی تو جسم نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آواز کا تعلق سماعت سے ہے لیکن صرف سماعت تک محدود نہیں ہے۔ ان آوازوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو ذہن میں گونجتی یا تیرتی ہیں جیسے بھولے بسرے گیتوں کی موسیقی یا ان لوگوں کی آوازیں جو ہم سے دور ہیں لیکن جن کا لب و لہجہ ہمارے ذہن میں محفوظ ہے یا آپ ضمیر کی آواز کے بارے میں کیا کہیں گے؟ کیا اس کو تعلق بھی سماعت سے ہے؟

میرا خیال ہے کہ "دشت تنہائی" کی مناسبت سے "آواز کے سائے" کا استعمال بہت خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ کسی چیز اور اس کے سائے میں مشابہت تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ مشابہت جزئیات میں نہیں ہوتی انگریزی میں یہ بولتے ہیں کہ

HE IS A SHADOW OF HIS FORMER SELF

اور اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی کی شخصیت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے کے باوجود تھوڑی بہت مشابہت اب بھی باقی ہے اور وہ مشابہت اس شخصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے ہم مانوس تھے یا جس سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ اسی طرح فیض نے " آواز کے سائے " سے یہ بات واضح کی ہے کہ محبوب کی آواز جو شاعر کے تخیل میں گونج رہی ہے وہ وہی جانی پہچانی آواز ہے جسے کبھی سن کر کانوں میں رس پڑتا تھا۔ وقت کے فاصلے اور محبوب کی دوری سے وہ آواز اب مبہم سی ہے (یا اس آواز کا سایہ ہے جو انھوں نے کبھی سنی تھی) جگر کا یہ شعر:

> وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
> وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شیلے نے (ADONAIS) میں (سطر ۱۲۴) آواز کے سائے کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> .... SHE PINED AWAY
> INTO A SHADOW OF ALL SOUNDS: A DREAR
> MURMUR BETWEEN THEIR SONGS ...

(۲) "ہونٹوں کے سراب" سراب کے معنی قریب نہیں ہے بلکہ قریب نظر ہے جو شعاعوں کے انعطاف (REFRACTION) سے پیدا ہوتا ہے۔ سراب ان چیزوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جن کا بظاہر وجود ہوتے ہوئے بھی حقیقتاً وجود نہ ہو۔ "ہونٹوں کے سراب" سے مراد ہے محبوب کے وہ ہونٹ جو فیض تخیل کی مدد سے دیکھتے ہیں لیکن در اصل جو جسمانی طور پر موجود نہیں ہیں (یعنی جو ہوتے ہوئے بھی نہیں ہیں) وہ ہونٹ جو فیض نے کبھی شاداب دیکھے تھے، محبوب سے جدا ہوکر اُن کے تخیل میں نظر آتے ہیں لیکن ان کی حقیقت سراب کی سی ہے۔ اسی خیال کو فیض نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" میں اس طرح ادا کیا ہے:

> سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
> تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
> تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
> تیری زلفوں کی مستی برستی رہی

(باقی)

براہ کرم خط و کتابت صرف جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کے نام سے کیجئے۔ (منیجر)

اردو دنیا

ٹونک میں یوم اختر

جناب منظور الحسن صاحب برکاتی سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک اطلاع دیتے ہیں کہ ۲۳، اکتوبر کی رات کو یہاں اردو کے مشہور و مقبول رومانی شاعر اختر شیرانی کی یاد میں یوم اختر منایا گیا۔ جلسہ کی صدارت اختر شیرانی کے ہم دیرینہ ابو العرفان مولانا محمد حبیب اللہ خاں صاحب فنائی نے فرمائی۔ جلسہ کی پہلی نشست میں جناب منظور الحسن برکاتی جناب مولانا سید حامد علی صاحب نقوی ناقد پروفیسر حامد رشید خاں صاحب نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ دوسری نشست میں نظموں کے دور کا آغاز کیا گیا جس میں شرکائے محفل کے کلام کے علاوہ اختر مرحوم کی چند پسندیدہ نظمیں پڑھی گئیں۔ مولانا فنائی نے اپنی صدارتی تقریر میں ٹونک کے ساتھ اختر شیرانی کی محبت و شیفتگی ان کی علما و صلحا کا ذکر کیا اور پروفیسر محمود شیرانی کی شخصیت پر بھی تبصرہ فرمایا۔

بنگالی ہندی کی کشمکش

اخبار الجمعیۃ اپنے اداریہ مورخہ ۲۴ اکتوبر میں رقمطراز ہے کہ بنگالی بھاشا کمیٹی نے مرکزی اور ریاستی حکومت سے لسانی کمیشن کی ہندی سفارشوں کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ لسانی کمیشن کی رپورٹ کے منظور کئے جانے کی صورت میں سارے بنگال میں ہندی کی مخالفت بھڑک اٹھے گی۔ کمیشن کی سفارشوں سے علاقائی زبانوں کی ترقی و ترویج کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

تعلیم بالغان کا افتتاح

انجمن معراج ادب گورکھپور کے زیر اہتمام ایک جلسہ مدرسہ اسلامیہ امداد العلوم پیپرا ہیڑ گورکھپور میں بتاریخ ۲۴ر اکتوبر منعقد ہوا جس میں تعلیم بالغان کا افتتاح کیا گیا۔ جلسے کی صدارت حافظ عبد العزیز صاحب نے کی۔

ڈالٹین گنج

(بہار) میں مشاعرہ سید اسمٰعیل نقوی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ ڈالٹین گنج پلاموں بہار میں ۲۰، اکتوبر کی شب میں مقامی شعرا کی ایک نئی انجمن حلقۂ شعر و سخن کا غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں طلبہ اور کہنہ مشق اساتذہ نے شرکت کی مشاعرے کے آخر میں حضرت مجھ کشفی نے شاعروں کی اہمیت اور ادب کے تعمیری مقاصد پر ایک مختصر تقریر فرمائی۔

شیو راج بہادر

ہیں سر افگندہ سرافرازانِ فن تیرے لئے
ماتمی ہے انجمن کی انجمن تیرے لئے

ہے شرابور اشکِ غم میں جامۂ ہستی کہ آہ
دیدۂ تر ہے بن ہر موئے تن تیرے لئے

بزم دہلی بن گئی ہے اک صف ماتم تمام
رو رہی ہے آج تہذیب کہن تیرے لئے

شیوۂ خلق و خلوص عام تھا مخصوص ذات
خاص تھا مہر و مروت کا چلن تیرے لئے

تیرے غم میں ہو گئی نالہ سرا بزم سرود
نوحہ گر رہنے لگے ہیں نغمہ زن تیرے لئے

ہیں تیرے احباب افسردہ حیات و تلخ زیست
اے شگفتہ چہرہ و شیریں سخن تیرے لئے

ساحل جمنا کا وہ نظارۂ آتش فشاں
تھا شبِ مہتاب میں صحن چمن تیرے لئے

چاند تجھ پر کر رہا تھا بارشِ انوار سرد
جب چتا تیری ہوئی شعلہ فگن تیرے لئے

اب کسے روئیں گے ہم رکھتے تھے کس کے واسطے
ختم کر ڈالے ہیں سب رنج و محن تیرے لئے

شام کو ساز کھنک اٹھتے تھے تیرے واسطے
صبح کو کھلتے تھے گلہائے چمن تیرے لئے

تو اٹھا رکھتا تھا جام مے ہمارے واسطے
جمع کر رکھتے تھے ہم شعر و سخن تیرے لئے

تو نے کتنی قیمتیں دے کر خریدے عمر بھر
اشک غم لوگوں کے تھے زر و عدن تیرے لئے

بسملِ محزوں پرو کر تار اشک و آہ میں
نذر کو لایا ہے گلہائے سخن تیرے لئے

بسمل سعیدی (دہلی)

انجمن کی خبریں

وزیر تعلیم پنجاب کا خط

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو پنجاب جناب ام پرکاش صاحب کے خط کے جواب میں وزیر تعلیم پنجاب جناب امر ناتھ ودیا النکار نے حسب ذیل جواب دیا ہے:۔

آپ کا ۲۲ اگست کا لکھا ہوا خط مجھے مل گیا تھا لیکن سہو نظر کی وجہ سے جواب نہ دیا جاسکا جس کا افسوس ہے۔ آپ کے خط کے جواب میں یہ عرض ہے کہ حکومت پنجاب کو اُردو زبان کا پورا لحاظ ہے اور وہ اس کو جائز مقام سے ہٹانے کی کوشش میں کبھی شریک نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ پنجاب میں لوگوں کی کثیر تعداد اُردو لکھتی پڑھتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہندی پنجابی کی نزاعی بحثیں تقریباً مجموعی طور پر اُردو زبان میں اور اُردو پریس کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اب بھی پنجاب میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو پڑھنا پسند کرتی ہے۔ زبان کا استعمال زیادہ تر خود عوام کی خواہشات پر مبنی ہے اور حکومت کو اپنے کاروبار کو عوام کی مطلوبہ زبان میں ہی چلانے کی فکر ہوسکتی ہے۔ مجھے اس چیز سے اتفاق نہیں ہے کہ پنجاب میں اُردو کو ختم کرنے کی کوئی ذہنیت ہے لیکن والدین کی طرف سے یہاں اُردو کی تعلیم کا کوئی مستقل مطالبہ نہیں ہے بلکہ وہ ہندی یا پنجابی کی تعلیم پر اصرار کرتے ہیں۔ اس لئے میں تجویز کروں گا کہ آپ کی انجمن اُردو کو ہر دلعزیز بنانے اور عوام کی تائید حاصل کرنے کی سخت کوشش کرے۔ حکومت اور اس کے محکموں کو اُردو تو کیا کسی زبان سے بھی خلاف تعصب نہیں ہے۔ وہ دوسری قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی میں اعانت کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

امرناتھ

غزل

کیوں بہار رنگ بو مانگیں کسی محفل سے ہم
گل بند صد چمن ہیں اپنے خون دل سے ہم

راستے میں خود فریبی کی وہ دل کش منزلیں
جلوہ گاہ ناز تک پہنچے بڑی مشکل سے ہم

مشربِ ارباب دل سے جیسے واقف ہی نہیں
ہیں مگر سنج تباہی عشوۂ قاتل سے ہم

تجھ میں تنگ نظریں ہیں تو کرم گستر مرا ... نہ پوچھ
کیا خیال آیا کہ اٹھ آئے تری محفل سے ہم

انجمن ہے دہر کی تاریک تو کچھ غم نہیں
ضو لیے بخشیں گے اختر جلوہ ہائے دل سے ہم

اختر تلہری

صدر انجمن ترقی اُردو دیگلور کو صدمہ

انجمن ترقی اُردو دیگلور کے ہر دلعزیز صدر جناب دشل راؤ صاحب دلیش مکھ کے چھوٹے بھائی اور ان کی ہمشیرہ کو بعض نا عاقبت اندیشوں نے انتہائی وحشیانہ طریقہ پر قتل کر دیا ہے۔ اس حادثہ سے پورے دیگلور کو صدمہ پہنچا ہے۔

گورنر آندھرا پردیش کو یادداشت

جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش محبوب نگر تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر صدر انجمن ترقی اُردو شاخ محبوب نگر آندھرا پردیش محمد عبدالرزاق خاں صاحب صوفی ایڈوکیٹ نے ایک یادداشت پیش کی کہ حکومت تقرر اور ترقی کے موقعوں پر اُردو داں طبقہ کی حوصلہ افزائی کا خیال رکھے۔ ابتدائی مدارس میں اُردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے پس پشت ڈالا جارہا ہے اکثر مدارس میں اُردو کتب خانوں کو ختم کیا جارہا ہے اور اُردو کتابوں کی خریداری بند کردی گئی ہے۔ محبوب نگر میں بیسک ٹریننگ اسکول کھولا گیا ہے جو تلنگی زبان جاننے والوں کیلئے محدود ہے اس میں اُردو جاننے والے مدرسین کا بھی انتظام کیا جائے۔ حکومت کے اعلانات، دفاتر اور عدالتوں کی اطلاعیں اور اداروں کی سائن بورڈیں، انگریزی و تلنگی کے ساتھ اُردو میں بھی شائع کی جائیں۔ شاہراہوں کے سنگ میل، اسٹیشنوں، عدالتوں اور دفاتر کے سائن بورڈ کی تختیاں اُردو زبان میں بھی تحریر کرائی جائیں۔

صفحہ ۶ سے آگے ... پیدا ہوئے شیخ کمال الدین محمد سعدی بتایا گیا ہے۔ یہاں سعدی تخلص نہیں ہے بلکہ ان کے والد نے اپنے پیر شیخ سعد الدین خیرآبادی کے نام پر ان کے نام کے آگے سعدی بڑھا دیا تھا۔ چنانچہ ان مزاروں میں بھی سعدی ہی کا ذکر یہ نہ ہو سکتا ہے کسی شعر کا ... نسبت نہیں ہے۔ شیخ فرید بھاکر یا نپوری نے بتحقیق ملفوظ حضرت شیخ نظام الدین بھکاری کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ سعدی دکنی دراصل سعدی لاہوری ہیں اور امیر خسرو کے ہم عصر تھے لیکن ملفوظ مذکورہ سے جو حوالہ دئے ہیں ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ بزرگ صاحب دیوان ہونے کے علاوہ دو شاعر بھی تھے یا یہ غزل انھیں سعدی کی ہے۔ غالباً مذکورہ ذہیر شیخ جو یہ غزل سعدی دکنی کے نام ہوگئی ہے اسی بنا پر عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ سعدی لاہوری شاعر بھی ہونگے لیکن یہ محض ایک قیاس ہے جس کی بنیاد پر کوئی بھی غلطی کرسکتے ہیں۔ عجیب شرف حاصل کیا ہے جو غزل ... ہے اس کا پتہ تاریخ ثابت و محققین دفتر ادب شمارہ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۳۲ ان کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ غزل سعدی لاہوری یا سعدی کاکوروی کی ہے جب تک کہ تحقیق سے کسی ایک کے حق میں ثابت ہو جائے تو اس کا کوئی کی طرح کوئی حرج نہیں ہے اور اگر ثابت ہوسکے تو شاعر کے نام کو فراموش نہ کیا جائے۔

موجودہ ہندستان میں اردو کے مسائل

بقیہ سلسلہ، گزشتہ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

اس کے بعد ۱۹۴۷ء آیا اور ہندستانی زبان کا خواب نئی حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ اس کو ایک رشی ایک پنڈت، اور ایک مولانا کی نیک نیتی بھی نہ بچا سکی اس لئے کہ یہ سیاست کا عطا کردہ نعرہ تھا جس کی کوئی لسانیاتی بنیاد نہ تھی اور آزادی کی تشکیل کے لئے اس کا کوئی مؤید نہ تھا۔ چنانچہ انھیں لوگوں نے جنھوں نے قوم کو نصف صدی تک ہندستانی کا خواب دکھایا اپنے قلم سے دستور میں یہ لکھا:۔

"ہندستان کی سرکاری زبان ہندی ہوگی جو
دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے گی۔"

دستور کی رو سے اردو ہندوستان کی ان چودہ زبانوں کی فہرست میں شامل ہے جن کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس فہرست میں سنسکرت کے علاوہ اردو واحد ایسی زبان ہے جو کسی یکجائی علاقے میں نہیں بولی جاتی۔ لیکن اردو اور سنسکرت کو ایک ہی قوسین میں رکھنا غلط ہے، اس لئے کہ سنسکرت ایک مردہ زبان ہے ہرچند کہ ہند آریائی السنہ کے ارتقا کے لئے اس کی حیثیت مسلم ہے اس کے برعکس اردو کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں پنجاب سے لے کر بہار اور مدھیہ پردیش سے لے کر حیدرآباد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اردو کی حیثیت اس بے ملک کے تاجدار کی سی ہے جس کے بارے میں سب طنزاً پوچھتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت آپ کی ریاست کہاں ہے؟ اردو اس حیثیت سے تاریخ لسانیات کا ایک دلچسپ معمہ بن گئی ہے۔ ہمہ گیر السنہ کی مثالیں سوئٹزرلینڈ، کناڈا اور یوگوسلاویہ میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن ان ممالک میں ہر زبان کا علاقہ علیحدہ ہے اس لئے کل ملک کی زبان کے انتخاب میں اختلاف رائے ہوتا رہا ہے لیکن علاقائی تنظیم میں کوئی دقت درپیش نہیں آئی۔ اس کے برعکس ہندوستان کی ایک تحصیل (کجا ضلع) بھی ایسی نہیں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہو اور جب اردو بولنے والوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو صرف اقرار باللسان کرنے والوں کو شمار نہیں کیا جاتا۔ اقرار بالقلب پیش نظر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اول الذکر حیثیت سے اس کے حلقے میں بہت بڑی تعداد آجاتی ہے جب کہ موخر الذکر کی تعداد محدود ہے، ایسے جو اردو کے ذریعہ اپنے بچوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ اور اس کے تحفظ کے لئے جدوجہد میں شریک ہوں۔

اس لسانیاتی انتشار نے اردو زبان کے رہنماؤں کی فکر کو پیچیدہ تر بنادیا ہے۔ بعض لوگ جذب کے عمل کو حجت تمام کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہ دوسروں کے آئینے میں فردا کو دیکھتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کو تقویت تاریخ لسانیات کے ان شواہد سے ملتی ہے جو اکثریت کی باریک پیسنے والی چکی کو مستقبل کا مقدر بنا دیتے ہیں ان لوگوں میں پھر دو گروہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے جو ہندی کو فی الفور اختیار کرلینے کے متمنی ہیں اور ایسے جو جذب کے کرب اور اس کی لذتوں کو طویل تر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خیال میں اردو کی موت برحق ہے اس کے لئے صرف لمحہ فرصت درکار ہے۔

لیکن اردو سماج عام طور پر اس انداز میں نہیں سوچتا یہ مریض مضطر رکھنے والا گروہ حقیقتوں کو کیفیات دل سے حل کرنا چاہتا ہے۔ پرانی اقدار کی شکست و ریخت پر اس کے یہاں وہ احساس کرب و عزم ملتا ہے جو تاریخ کے دھارے کے مقابل میں فصیلیں اور خندقیں تعمیر کرتا ہے تمدنی حالات میں اس عزم اور جذبۂ بے اختیار کو یکسر بے معنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لسانیاتی نقطۂ نظر سے مختلف زبانوں کے تصادم کا انجام حسب ذیل شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔ بعض اوقات کل علاقہ غالب زبان کو اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ رومن فاتحین

گال کے علاقے میں لاطینی کو سر کر گئے اور وہاں کی کیلٹک زبان کو ختم کردیا۔ یا شمال مغربی ہندستان کے اندر سے آریہ قبائل ۱۵۰۰ ق۔م۔ کے قریب اس ملک میں داخل ہوئے اور شمالی ہند کی دراویڈی اور آسٹرک زبانوں کو مسخر کرلیا۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مغلوب زبان کسی بڑے سیاسی اور تہذیبی انقلاب کی کروٹ کے بعد تمام علاقے کی زبان بن جائے جیسا کہ نارمن فرینچ کی مثال سے ظاہر ہے جو انگلستان میں نارمن فتوحات کے ساتھ ۱۰۶۶ء میں داخل ہوئی لیکن انگریزی کے سیلاب میں تین سو سال کے عرصے میں دریا برد ہوگئی۔ پہلی صورت ہندستان میں کبھی بھی ممکن نہ ہوسکی۔ اسی لئے دو تہذیبوں کے تصادم کا سمجھوتہ ایک آمیختہ زبان اردو میں نکلا۔ دوسری صورت یعنی مغلوب زبان کا غلبہ۔ اس وقت درپیش ہے۔ یوپی بہار، حیدرآباد اور دیگر علاقوں میں غالب زبان کے خلاف سخت قسم کا ردعمل ہے نئی ہندستانی قومیت نے ہندی اور اس کے پردے میں سنسکرت کے احیاء کو دستوری دفعہ کے تحت بیڑا اٹھالیا ہے۔ ہندی اس وقت عربی فارسی عناصر کو صرف تہذیبی لین دین کی سطح تک قبول کرنے کو تیار ہے اس کے مستند اداروں نے عربی فارسی آوازوں کو خارج از ہندی قرار دے دیا ہے۔ اردو رسم خط کو حروف القرآن کہہ کر اس پر فرقہ پرستی کا الزام پہلے سے قائم تھا۔ اب صرف و نحو کی سطح پر عربی فارسی کے جو قلم لگائے گئے تھے ان پر [illegible] کا اطلاق ہونے لگا ہے۔ انشاءاللہ خاں کی رانی کیتکی کی کہانی "جس میں ہندوی چھٹ دوسری زبان کی پٹ نہ آنے پائے" کا التزام رکھا گیا ہے۔ ترکیب نحوی اور جملوں کی ساخت کے لحاظ سے مستند ہندی نثر کا نمونہ نہیں سمجھی جاتی۔ غرض کہ اس وقت ہندستان میں بیرونی لسانی اثرات کے خلاف اسی قسم کا محاذ قائم ہے جیسا کہ ایرانیوں نے عہد جدید میں عربی کے خلاف کیا، یا جرمنوں نے لاطینی اور فرانسیسی الفاظ کے خلاف کیا تھا۔

(باقی)

حلقۂ ادب علی گڑھ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مقالے پر تبصرہ

(بہ سلسلہ گزشتہ)

اس کے بعد ڈاکٹر اشرف صاحب نے تقریر کی اور فرمایا کہ اردو کا سوال قومی اتحاد کے سوال سے وابستہ ہے۔ اردو کو دوسری زبانوں پر اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ اس نے صدیوں کی تہذیب کو جذب کیا ہے اور ہندستان کے بے شمار باشندوں کے بہترین حسیات کی ترجمان ہے۔ خوش قسمتی سے ۱۰ سال پیشتر کے مقابلے میں آج حالات بہت بہتر ہیں اردو کو ہندستان کی ایک مستقل علاقائی زبان تسلیم کیا جاچکا ہے جن صوبوں کی مادری زبان ہندی نہیں ہے وہاں لوگوں میں ہندی کے جارحانہ تسلط کے خلاف بیزاری کا جذبہ پیدا ہوچکا ہے۔ اب اردو کی مخالفت میں وہ شدت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ہمیں چاہیے کہ ان موافق حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

سب سے آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے ایک مفصل اور مدلل تقریر فرمائی جس میں انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے اور اردو کی ابتدا بول چال کی زبان کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ زبان کے ابتدائی دور میں اردو پر فارسی اور عربی زبان کا اثر تھا اور ایک حد تک اس پر اسلامی تہذیب کی چھاپ

تھی لیکن یہ صورت حال کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ایک فطری اور لازمی نتیجہ تھا۔ میرے خیال میں اردو سے تعصب اور مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زبان کو مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی غلبہ کی نشانی تصور کیا جاتا ہے۔ شروع میں جب یہ تحریک ہوئی کہ سرکاری کاغذات ناگری رسم الخط میں لکھے جائیں تو اردو والوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس وجہ سے ہندی والوں کی ضد اور بڑھ گئی۔

کانگریس کے دور سے پہلے ہندی اپنی ایک الگ ادبی حیثیت اختیار کر چکی تھی لیکن روزمرہ کی بول چال اور عام خیالات کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی تھی اس میں سنسکرت کے الفاظ کا غلبہ نہیں ہوتا تھا۔ سنسکرت زدہ ہندی کا چلن ساہتیہ سمیلن کی نیم سیاسی نیم لسانی تحریک سے بڑھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جب تک ہم ہندی سے فارسی عربی الفاظ خارج کر کے اس کا ایک الگ ڈھانچہ نہ بنائیں گے اس وقت تک اس پر اردو کا تسلط رہے گا۔ ساہتیہ سمیلن سے پہلے ہندی کی تحریک خالص تہذیبی تحریک تھی لیکن اس سوسائٹی نے سیاسی بنیادوں پر سنسکرت کو ہندی پر غالب کر دیا تاکہ مسلمانوں کی تہذیب کا اثر بالکل ختم ہو جائے۔

یہ تھی صورت حال ۱۰ سال پہلے جب کانگریس کی دوبارہ حکومت قائم ہوئی اور اب یہ صورت ہے کہ یوپی اور پنجاب کے اَن پڑھے لکھے باشندوں میں بھی جن کی زبان اردو ہے ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اگرچہ نہ ہندی جانتے ہیں نہ ناگری پڑھ سکتے ہیں پھر بھی تہذیبی اور جذباتی بنیادوں پر اردو کو چھوڑنا چاہتے ہیں اور اپنی اولاد کو یہ زبان نہیں پڑھانا چاہتے۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو کچھ مدت کے بعد صرف مسلمانوں کی زبان کی حیثیت سے باقی رہ جائے گی۔ اس وقت اردو والوں کے لئے دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ مسلمان اسے صرف اپنی زبان کی حیثیت سے باقی رکھیں دوسرا یہ کہ شعوری طور پر اردو کو ہندی کے قریب لانے کی کوشش کی جائے۔ میری رائے میں ہندی کی تشکیل اور ترقی میں جو راشٹر بھاشا بن گئی ہے، مسلمانوں کو پورا پورا حصہ لینا چاہئے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کتابیں ہندی رسم خط میں شائع کی جائیں اور اردو کو بول چال کی زبان سے قریب لایا جائے۔ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم اردو میں عربی فارسی کے الفاظ کے بجائے ان کے ہم معنی ہندوستانی الفاظ استعمال کریں۔ ہمیں اپنی تحریر و تقریر میں عربی ترکیبوں اور عربی جمع وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہئے جس حد تک ہم اردو کو بول چال کی زبان سے قریب لائیں گے اتنا ہی اس کی مقبولیت بڑھے گی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے آگے چل کر فرمایا کہ موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہمیں ہندی تو سیکھنا ہی چاہئے اور اپنی اولاد کو بھی پڑھانا چاہئے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں اردو کی بھی تعلیم دینا چاہئے۔

ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اب سے پچاس ساٹھ سال بعد کیا نقشہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہندی زبان اپنا رجحان بدلے گی، اور ہندی کے مشترک سرمایہ کو اپنا لے گی، اردو اور کھڑی بولی کے آسان محاوروں اور عربی فارسی کے عام فہم الفاظ کو قبول کرے گی تو اردو کا بھی قدرتی رجحان یہ ہوگا کہ وہ ہندی کے زیادہ قریب آ جائے اور مجھے یہ بات ناممکن نہیں نظر آتی ۵۰-۶۰ برس کے بعد دونوں زبانیں ایک ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر رسم خط کا معاملہ زیادہ اہم نہیں رہتا۔ اگر مسلمان قرآن پڑھتے رہیں گے اور ان کا رشتہ دوسرے اسلامی ممالک کے باشندوں سے قائم رہے گا تو عربی اور ہندی دونوں رسم خط میں اردو لکھی جانے لگے گی۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

مسعود علی ندوی معتمد اعزازی حلقہ ادب

(... پرنٹر پبلشر نے ... پریس میں چھپوا کر مرکزی انجمن علی گڑھ سے شائع کیا)